محمد اکرام چغتائی

پیامِ مشرق

(چند تصریحات)

علامہ اقبال کی تیسری شعری تصنیف ''پیامِ مشرق'' فارسی میں لکھی گئی، لیکن اس کا دیباچہ اُن کی پہلی فارسی کتاب ''اسرارِ خودی'' کی طرح اُردو میں تحریر کیا گیا۔ قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے تخلیقی محرکات میں پہلی جنگِ عظیم میں ہونے والی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کا بڑا عمل دخل ہے اور اقبال جیسے عالمی سیاسیات کے زیر و بم پر گہری نظر رکھنے والے شاعر اور مفکر کے قلب و ذہن پر جو اثرات پڑے اور اُنھوں نے جس زاویۂ نظر سے پوری صورتِ حال کا تجزیہ کیا، وہی شعری قالب میں ڈھل کر اس کتاب کے صفحات پر منتقل ہو گیا۔ اس کے دیباچے میں وہ رقمطراز ہیں کہ ''یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دُنیا کی تعمیر کر رہی ہے۔'' اور اس دُنیا کا خاکہ ان کے خیال میں آئن شٹائن اور برگساں نے پیش کیا ہے، لیکن اقبال نے اس میں ۱
رنگ بھر کے اسے نمایاں کر دیا ہے۔

مختلف اصحاب کے نام اقبال کے مراسلات سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے تقریباً چار برسوں میں ''پیامِ مشرق'' مکمل کی اور وہ اس دوران میں اس کی ترتیب اور مندرجات میں مسلسل ردّ و بدل کرتے رہے۔ ان کی کم و بیش سبھی شعری تالیفات کی بیاضوں میں، جو خوش قسمتی سے اب تک اقبال میوزیم میں محفوظ ہیں، حسنِ کلام اور طرزِ اسلوب کو خوب سے خوب تر بنانے کا یہ عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ اُن کی یہ متحرک تخلیقی استعداد ''پیامِ مشرق'' کے تخلیقی اور شعری

پیرایوں کو سنوارتی رہی اور بالآخر اس نے وہ صورت اختیار کر لی، جس میں یہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ تحریری شواہد کے مطابق اقبال نے سب سے پہلے اپنی اس زیرِ تالیف کتاب کا ذکر اپنے فاضل دوست سیّد سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب (بابت ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۹ء) میں کیا ہے:

> ''فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں، جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی، کچھ اُردو میں۔ کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے، لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ اِدھر توجہ کر سکوں، تاہم جو کچھ ممکن ہے، کرتا ہوں۔'' (۱)

تقریباً پون سال بعد وہ اپنے ایک نوجوان مکتوب الیہ پروفیسر محمد اکبر منیر کو لکھتے ہیں (بحوالہ خط بابت ۴/اگست ۱۹۲۰ء):

> ''اب میں گوئٹے کے ''دیوان'' کے جواب میں ایک فارسی دیوان لکھ رہا ہوں، جس کا ایک تہائی حصہ لکھ چکا ہوں۔'' (۲)

اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ برس تک کسی مکتوب الیہ سے اس کتاب کے محرک یا مندرجات وغیرہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ البتہ بعض احباب کے مراسلات میں اس زیرِ تالیف کتاب کے متفرق اشعار نقل کیے جاتے رہے یا بعض منظومات کے بارے میں اُن سے صلاح و مشورہ ہوتا رہا۔ (۳) بالآخر وہ مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو یہ اطلاع دیتے ہیں (مکتوب بابت ۱۹/مارچ ۱۹۲۲ء):

> ''پیامِ مشرق جو میں نے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ''دیوانِ مغربی'' کے جواب میں لکھا ہے، چھپ رہا ہے۔ انشاء اللہ اس کی ایک کاپی پیش کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ سرکار اسے پسند فرمائیں گے۔'' (۴)

چند روز بعد وہ ایک بار پھر سیّد سلیمان ندوی کو یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں (مکتوب بابت ۱۴رمئی ۱۹۲۲ء):

> ''گوئٹے (شاعر جرمن) کے ''مشرقی دیوان'' کے جواب میں میں نے ایک مجموعہ فارسی اشعار کا لکھا ہے۔عنقریب شائع ہوگا۔ اس کے دیباچے میں یہ دِکھانے کی کوشش کروں گا کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے۔''(۵)

متذکرہ بالا اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) ''پیامِ مشرق'' کی تصنیف کا اصل محرک گوئٹے کی شخصیت یا عالمی ادب میں اسے بلند مقام پر فائز کرنے والے مختلف النوع تخلیقی کارہائے نمایاں یا سب سے بڑھ کر اس کی معرکتہ الآرا تصنیف ''فاؤسٹ'' جس کی تخلیقی بلند پروازیوں کی تعریف میں اقبال عمر بھر رطب اللسان رہے، بھی نہیں۔ بلکہ اس کا ''دیوان شرق وغرب'' ہے، جسے عرفِ عام میں ''دیوانِ شرقی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲) اس کتاب کا نصف حصہ مکمل ہونے تک اقبال اس میں فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو نظموں کو بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن بعد میں کسی وجہ سے اُنھوں نے اس کتاب کو صرف فارسی کلام کے لیے مختص کر دیا۔ ممکن ہے، بعد میں اُن منظومات کو اپنے پہلے اُردو مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' (طبع اوّل ۱۹۲۴ء) میں شامل کر دیا ہو۔

(۳) حتمی تواریخ کا تعین تو قدرے مشکل ہے، لیکن اندازاً ''پیامِ مشرق'' تین سال (۱۹۱۹ء تا اواخر ۱۹۲۱ء) میں اختتام کو پہنچی اور اس کے فوراً بعد اس کی طباعتی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۱۹رمارچ ۱۹۲۲ء کو وہ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کو اس کے زیرِ طباعت ہونے کا مژدہ سناتے ہیں۔

ان مکتوبات کے علاوہ اس دَور میں اقبال کی لکھی ہوئی بعض دیگر تحریروں کے بنظرِ غائر جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء کے آخر تک اس کتاب کا حتمی مبیضہ تیار ہو چکا تھا اور

وہ کتابت کے بعد برائے طباعت پریس بھجوانے کے لیے تیار تھا۔ اقبال کے تمام سوانح نگاروں نے اُن کو برطانوی حکومت کی جانب سے ''سر'' کا خطاب ملنے کا تفصیلی ذکر کیا ہے (یکم جنوری ۱۹۲۳ء) اور معاصر اخبارات و جرائد میں اس خطاب کی پذیرائی اور مخالفت میں طبع ہونے والی خبروں اور تبصروں کے ذکر کے علاوہ اس تقریب کی بھی تفصیلات فراہم کی ہیں، جو اس حوالے سے اقبال کے اعزاز میں مقبرۂ جہانگیر کے سبزہ زار میں منعقد ہوئی تھی (۱۷/جنوری ۱۹۲۳ء)۔ اس یادگار اجتماع میں گورنر پنجاب کے علاوہ اعلیٰ سرکاری عہدیدار اور عمائدینِ شہر کثیر تعداد میں شریک ہوئے، جن کی فرمائش پر اقبال نے اظہارِ تشکر کے بعد زیرِ طبع ''پیامِ مشرق'' سے چند نظمیں سنائیں اور یہاں بھی اس بات کی صراحت کی کہ اُنھوں نے یہ کتاب گوئٹے کے جواب میں لکھی ہے۔(۶) اس تقریب کے ایک ماہ بعد لاہور سے شائع ہونے والے ایک ادبی مجلّہ ''رسالہ ہزار داستان'' (مدیر حکیم احمد شجاع) میں اقبال کے قریبی معتمد چوہدری محمد حسین نے ''پیامِ مشرق'' کے مندرجات پر ایک تفصیلی تعارفی تبصرہ شائع کرایا، جسے قبل از طباعت تبصرے کی حیثیت حاصل ہے۔(۷) علاوہ ازیں انہی دِنوں کے تحریر کردہ دو خطوں میں بھی اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کے عنقریب شائع ہونے کی نوید سنائی ہے۔ بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا کو لکھتے ہیں (بابت ۱۸/فروری ۱۹۲۲ء):

> ''پیامِ مشرق نام ایک مجموعۂ نظم جو فارسی میں ہے، تیار ہو رہا ہے۔ شاید دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ انشاء اللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا، لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں، اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہنچے تو بلا تکلف یاد دِلا دیجیے۔''(۸)

اور بنام عبدالماجد دریابادی (بابت ۱۷/اپریل ۱۹۲۳ء):

> ''پیامِ مشرق اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں، لیکن افسوس ہے اُنھیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے

۷۰۶

علاوہ والدِ مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے، اُسے شائع کر دیا جائے۔
آپ کے نوجوان دوست کے تبصرہ ''پیام'' کو میں شوق سے پڑھوں گا۔''(۹)

بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ ''پیامِ مشرق'' کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۲۴ء کے شروع میں منظرِ عام پر آیا۔(۱۰) اس کے شعری اور فکری محاسن کے علی الرغم سابقہ تشہیر نیز حکومت کی حالیہ قدر افزائی کے پیدا کردہ ماحول نے اس کتاب کی مانگ میں معتد بہ اضافہ کر دیا اور چند ہی ماہ میں اس کا پورے کا پورا پہلا ایڈیشن فروخت ہو گیا۔ قارئین کی اس غیر معمولی پذیرائی کے سبب جلد ہی اس کتاب کی اشاعتِ ثانی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لیکن اقبال طبعِ اوّل کو بعض ترامیم و اضافات کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ فارسی ادبیات کے نامور پروفیسر روبن لیوی (Reuben Levy) کے نام مکتوب (بابت ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۳ء) میں لکھتے ہیں:

''... میری کتاب ''پیامِ مشرق'' جو گوئٹے کے ''دیوانِ مشرق ومغرب'' کے جواب میں لکھی گئی ہے، شاید آپ کے لیے باعثِ دلچسپی ہو۔ یہ کتاب چند ہی مہینے ہوئے شائع ہوئی تھی اور اس کا ایک دوسرا ایڈیشن ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ عنقریب ہی نکلنے والا ہے۔ چنانچہ میں اس کا ایک نسخہ آپ کو بھیجنے کی جسارت کر رہا ہوں اور میری بڑی خواہش ہے کہ آپ اس کے بارے میں اپنی رائے سے مجھے آگاہ کریں۔''(۱۱)

اپنے ایک مکتوب بنام سیّد سلیمان ندوی (بابت ۵/جولائی ۱۹۲۳ء) میں فرماتے ہیں:

''پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے، اُنہوں نے اسے بہت پسند کیا ہے اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔(۱۲) وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور اوریجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے، مگر میرے لیے آپ کی رائے نکلسن کی

رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔"(۱۳)

چند ماہ بعد یعنی ۱۹۲۴ء کے اوائل ہی میں "پیامِ مشرق" کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہو گیا۔ اس کے طبع ہوتے ہی اقبال نے اس کا ایک نسخہ "اسرارِ خودی" کے مترجم آر۔اے۔ نکلسن کے توسط سے معروف ایران شناس ڈاکٹر ایڈورڈ جی۔ براؤن کو ارسال کیا۔ اس نسخے کے سرورق پر اقبال نے اپنے دستخط کے ساتھ ۱۰ر مارچ ۱۹۲۴ء کی تاریخ بھی لکھ دی ہے۔(۱۴) اس کتاب کا یہی وہ ایڈیشن ہے، جو اب تک مروج ہے۔ اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) تک اس کا ایک اور ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں اشاعت پذیر ہوا، لیکن اس میں مزید قطع و برید نہیں کی گئی۔(۱۵)

جیسا کہ درجِ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے زیرِ نظر کتاب جرمنی کے قومی شاعر گوئٹے کے "دیوانِ شرقی" کے جواب میں لکھی اور جب یہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، تو عنوان کے تحت قوسین میں "درجواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے" کے الفاظ لکھ کر اپنے اس دعویٰ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اُنہوں نے جابجا گوئٹے کے ساتھ انیسویں صدی عیسوی کے ایک اور جرمن شاعر ہائنرخ ہائنے (Heinrich Heine) کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن کی انڈیا سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ تقریب میں اُنہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

> "میری تیسری تصنیف "پیامِ مشرق" ہے، جو گوئٹے کے دیوان کے انداز و اسلوب پر لکھی گئی تھی۔ اس کے بعض حصوں میں جرمن شاعر ہائین اور گوئٹے کا جواب ہے۔"(۱۶)

ہائنے کو شامل کرنے کی شاید یہ وجہ ہے کہ اس کتاب کے مروجہ ایڈیشن میں ایک نظم "زندگی و عمل" اس کی نظم "سوالات" کے جواب میں لکھی گئی، لیکن عام طور پر وہ اپنی اس تصنیف کو گوئٹے کے "دیوانِ شرقی" ہی کا جواب کہتے رہے۔

"پیامِ مشرق" کے ذیلی عنوان کے پیشِ نظر قاری یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ اس کتاب کے طرزِ بیان اور اندازِ فکر پر گوئٹے کے "دیوانِ شرقی" کے گہرے اثرات پڑے ہوں

گے اور اقبال نے اس کے تخلیقی خصائص سے بھرپور استفادہ کیا ہوگا، لیکن کتاب کے اول تا آخر مطالعے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اُنہوں نے گوئٹے کی اس تصنیف سے براہِ راست کچھ بھی اخذ نہیں کیا۔ کم از کم ''پیامِ مشرق'' کی اشاعتِ اوّل کے حوالے سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے۔ ابتدا میں ''پیشکش بحضور حضرت امیر امان اللہ خان فرمانروائے دولت مستقلہ افغانستان'' کے ذیل میں اقبال نے مختلف حیثیتوں سے گوئٹے کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہوئے اسے برتر مقام دیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک نظم بعنوان ''جلال و گوئٹے'' میں مولانا رومی اور اس جرمن شاعر کا تقابل کیا ہے اور ایک شعر میں ''گلشن ویمر'' کی وہی ترکیب استعمال کی ہے (ص۱۸۴) جو اُنہوں نے برسوں پہلے اپنی اُردو نظم ''غالب'' (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) میں استعمال کی تھی۔ ''پیامِ مشرق'' کی قلمی بیاض (مخزونہ اقبال میوزیم، لاہور) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظم کا عنوان ''شوپنہار اور گوئٹے'' رکھا گیا، لیکن بعد میں اقبال نے خود گوئٹے کے نام پر خطِ تنسیخ پھیر کر اس کی جگہ نیٹشے لکھ دیا، چنانچہ اب یہ نظم ''شوپن ہار و نیٹشا'' کے زیرِ عنوان موجود ہے۔ ان چند حوالوں کے علاوہ ''پیامِ مشرق'' میں کہیں گوئٹے کا نام تک موجود نہیں اور اس کی تصنیف کے اصل محرک یعنی ''دیوانِ شرقی'' کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دیکھتے دیکھتے ختم ہوگیا، تو اقبال نے اس کی اشاعتِ ثانی کی تیاریاں شروع کر دیں، لیکن اس کے لیے اُنہوں نے بعض ترمیموں اور اضافوں کو بھی ضروری سمجھا، جیسا کہ اُنہوں نے روبن لیوی کے نام اپنے خط میں ذکر کیا ہے (حوالۂ مذکور)۔ ممکن ہے حک و اصلاح کے اس عمل میں اُنہیں یہ احساس ہوا ہو کہ کتاب کے ذیلی عنوان کا بھرم رکھنے کے لیے ''دیوانِ شرقی'' سے بلاواسطہ طور پر کچھ نہ کچھ ضرور شامل کیا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے دو نئی نظموں ''حور و شاعر'' اور ''جوئے آب'' کا اضافہ کیا اور اُنہیں اپنے قلم سے لکھ کر طبع اوّل کے مطبوعہ متن میں متعلقہ جگہوں پر چسپاں کر دیا، تاکہ طبع دوم میں اُنہیں لازماً شامل کیا جائے۔ ان اضافہ شدہ منظومات میں اوّل الذکر ''دیوانِ شرقی'' کی اسی عنوان کے تحت نظم سے ماخوذ ہے، جبکہ ثانی الذکر کا مرکزی خیال گوئٹے کے ایک نامکمل ڈرامے کے گیت ''نغمۂ محمدؐ'' سے لیا گیا ہے۔ ان تصریحات

کی روشنی میں دیکھا جائے تو ''پیامِ مشرق'' کو گوئٹے کی جس تصنیف (یعنی ''دیوانِ شرقی'') کا جواب کہا گیا ہے۔ اس سے براہِ راست صرف ایک نظم ہی ماخوذ ہے اور اس کے علاوہ گوئٹے کا تذکرہ ایک عمومی شاعر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

اقبال کے زمانۂ کیمبرج کے دوست نکلسن نے ان کی اولیں فارسی شعری تصنیف ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی ترجمہ کیا (۱۹۲۰ء)، جس نے اقبال کی شخصیت اور فکر کو انگلستان کے علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔ نہ صرف انگلستان میں بلکہ دیگر یورپی ممالک بالخصوص جرمن بولنے والے ملکوں میں اقبال کو روشناس کرانے کا سہرا بھی نکلسن ہی کے سر ہے۔ اقبال نے ''پیامِ مشرق'' (طبعِ اوّل) شائع ہوتے ہی اس کا ایک نسخہ نکلسن کو بھجوا دیا، جس کو اُنہوں نے پسند کیا اور اس کے انگریزی ترجمہ کا بھی ارادہ کرلیا۔ وہ کسی وجہ سے ترجمہ تو نہ کر سکے، لیکن جونہی اُنہیں اس کے دوسرے ایڈیشن کا نسخہ پہنچا تو اُنہوں نے ایک سیر حاصل تعارفی مضمون جرمنی سے شائع ہونے والے علمی مجلّہ ''اسلامیکا'' (لائپ تسگ) کے پہلے شمارے (۱۹۲۵ء) میں چھپوا دیا۔ مندرجاتِ کتاب کے اس مفصل تعارف نے علومِ شرقیہ سے دلچسپی رکھنے والے جرمن خاور شناسوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اس پر مستزاد یہ کہ گوئٹے کے حوالے سے بھی اس کتاب کو پڑھنے اور اس کے مصنف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، بلکہ اس وقت جرمن ادب کی مشرقی تحریک کے جو اِکا دُکا پیروکار بقیدِ حیات تھے، اُنہوں نے اس کتاب کی پذیرائی کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ بعض معروف جرمن مستشرقین کے ساتھ اقبال کی مراسلت کا آغاز ہوا۔ ارلانگن یونیورسٹی کے ایک کلاسیکی عربی زبان کے عالم جوزف ہیل (Josef Hell، ۱۸۷۵ء–۱۹۵۰ء) کے دو غیر مطبوعہ خطوط (بابت ۱۰/مارچ و یکم مئی ۱۹۳۲ء) سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے ''پیامِ مشرق'' کا جرمن ترجمہ شروع کر دیا تھا، جو چند برسوں میں مکمل ہوگیا اور ابھی تک اسی یونیورسٹی میں بصورتِ مسودہ پڑا ہوا ہے۔ برلین میں مقیم ایک شاعر نے تو اقبال کی نظموں کے (جو نکلسن کے تبصرے میں بطور نمونہ کلام درج کی گئیں) آزاد تراجم کر دیئے اور اُنہیں دیدہ زیب اور منقش مجلدات کی شکل میں اقبال کو ارسال

کیا۔ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ پون صدی میں جرمنی میں اقبال شناسی کی روایت نے جو ترقی کی ہے، اس کی ابتدا نکلسن کے متذکرہ بالا مضمون ہی سے ہوئی۔

اقبال نے اپنی تحریروں میں اتنے تواتر سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ''پیامِ مشرق'' گوئٹے کے ''دیوان'' کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی بالعموم اہلِ تحقیق اور بالخصوص ماہرینِ اقبالیات کو اس 'جواب' کے 'سوال' کو ڈھونڈ نکالنا چاہیے تھا اور ان دونوں کے عمیق اور جامع تقابلی مطالعہ کے بعد 'سوال' کے ایسے فنی اور فکری پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیے تھا، جو اقبال کے لیے محرک ثابت ہوئے، لیکن ایسا مطالعہ تو دُور کی بات ہے، 'جواب' کو شائع ہوئے تقریباً پون صدی گزر گئی، ابھی اس 'سوال' کا کوئی معقول اُردو ترجمہ تک شائع نہیں ہوا۔ بیچ بیچ میں جرمن ادبیات کے بعض شائقین (مثلاً ڈاکٹر ممتاز حسن اور ڈاکٹر ریاض الحسن) نے 'دیوان' کے بعض حصوں کو اُردو میں منتقل کیا، لیکن اس کے مستند ترجمہ (حواشی سمیت) کی ضرورت ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ اگر ترجمہ براہِ راست جرمن سے ہو اور اس پر لکھے گئے گوئٹے کے نوٹس سے بھی استفادہ کیا جائے، تو یہ اقبال شناسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا، اور اگر اس زبان سے ناواقفیت سدِ راہ ہو تو اس 'دیوان' کے اب تک شائع ہونے والے منظوم اور نثری انگریزی تراجم ہی کو سامنے رکھ کر اس کا اُردو ترجمہ کر دیا جائے تو بھی غنیمت ہے۔ اس کے برعکس جرمن اہلِ علم نے اپنے قومی شاعر کی ایک کتاب کے 'جواب' یعنی ''پیامِ مشرق'' کا جرمن ترجمہ اقبال کی زندگی ہی میں اُن کی اجازت سے شروع کر دیا تھا اور اسے اُن کی وفات سے قبل مکمل بھی کر لیا تھا، لیکن بہ وجوہ وہ شائع نہ ہو سکا۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کر معروف جرمن اقبال شناس خاتون پروفیسر آنیماری شیمل نے اپنے طور پر اس کا ترجمہ کیا، جو جرمنی سے ۱۹۶۳ء میں چھپا۔ اُن کی دیکھا دیکھی دیگر یورپی زبانوں (فرانسیسی، چیک وغیرہ) میں بھی اس کے تراجم منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ جہاں تک اقبال کے 'جواب' اور گوئٹے کے 'سوال' کے مندرجات کے تقابلی مطالعہ کا تعلق ہے، تو اس ضمن میں ''پیامِ مشرق'' کے جرمن مترجمین یا اقبالیات سے عمومی یا خصوصی دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ البتہ اُن دونوں شخصیات کو مشرق اور

مغرب کے مابین پُل قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا، لیکن یہ پُل جن مضبوط ستونوں پر کھڑا ہے، ان کو لائقِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔

گوئٹے کی حیات و تصانیف کے ناقدین اور محققین میں بعض 'دیوان' کو 'فاوسٹ' کے بعد گوئٹے کی اہم ترین تصنیف قرار دیتے ہیں اور بعض نے اسے تخلیقی اعتبار سے عام سطح کی تالیف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اختلافِ رائے کے باوصف گوئٹے پر لکھنے والے تقریباً ہر قلمکار نے 'دیوان' کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اب تک اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں اور مقالوں کی صورت میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی ایک علیحدہ جامع فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ ان مطالعات میں ان عوامل کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، جن کے تحت 'دیوان' معرضِ وجود میں آیا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں گوئٹے کی ملاقات آسٹریا کی ایک حسین انتیس سالہ شادی شدہ رقاصہ سے ہوئی اور وہ دل و جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ ہائیڈل برگ کے رومان پرور ماحول نے اس کی آتشِ عشق کو اور تیز کر دیا۔ وہ خود تو اس آگ میں جل ہی رہا تھا، لیکن اس کی حدت نے فریقِ ثانی کے جذبات میں بھی ہل چل مچا دی۔ ایک روایت کے مطابق اس نے گوئٹے کے زیرِ اثر اپنے جذبات کو شعری پیرائے میں بیان کرنا شروع کر دیا اور اس کی کچھ نظموں کو گوئٹے نے اپنے 'دیوان' میں شامل کر لیا۔ انھی ایامِ جذب و مستی میں گوئٹے کو کہیں سے ''دیوانِ حافظ'' کا وہ جرمن ترجمہ مل گیا، جو چند سال قبل ۱۸۱۲ء میں آسٹریا کے معروف مستشرق ہامر پورگشتال نے دو جلدوں میں شائع کرایا تھا۔ اس ترجمہ کے مطالعہ نے گوئٹے کے خرمنِ قلب و جگر کو جلا کر رکھ دیا اور اس فارسی شاعر کے تخیل، تلمیحات و تمثیلات اور جذب و مستی میں ڈوبے ہوئے شعری پیرایۂ اظہار نے اس کی تصوراتی کائنات میں طوفان بپا کر دیا۔ گوئٹے کی شخصیت کا یہ ایک عجیب پہلو ہے کہ جب وہ جادۂ عشق میں آسودۂ منزل ہونے کے قریب پہنچتا ہے، تو راہِ فرار اختیار کر جاتا ہے اور پھر عمر بھر ادھر منہ موڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ پیرانہ سالی کے اس انوکھے عشق کا بھی یہی انجام ہوا اور اس نے ہائیڈل برگ کی عشق افزا وادیوں کو یوں خیر باد کہا کہ پھر یہاں قدم نہیں رکھا۔ اس ترکِ تعلق کے بعد اس کے قدم کسی نئی منزل کی جانب بڑھ گئے، لیکن اس چند سالہ

زمانۂ عشق میں وہ جن ذہنی اور قلبی وارداتوں اور کیفیتوں سے گزرا، اُنہیں اس نے 'دیوان' میں انتہائی خوبصورتی سے قلمبند کر دیا۔ یوں دیکھا جائے تو 'دیوان' گوئٹے کے ایک بھرپور عشق کی داستان ہے، اور اس کتابِ عشق کے حاشیوں کو اس نے حافظ کے شعری نقش و نگار سے مزین کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اسلامی مشرق کی تاریخ اور ادب سے گوئٹے کی دیرینہ دلچسپی کے آثار بھی واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود شاعر نے اپنی مغربیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنی تصنیف کی مغربی فضا کو قائم رکھا ہے اور مشرقیت کو اس پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

مختصراً اس 'سوال' کی یہی حقیقت ہے، جس کا 'جواب' اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کی صورت میں دیا ہے۔ بظاہر 'سوال' اور 'جواب' دونوں میں کوئی فنی یا موضوعی مشابہت دِکھائی نہیں دیتی۔ 'دیوان' تو گوئٹے کی حیاتِ معاشقہ کے ایک مخصوص دورِ سرور و نشاط کی یادگار ہے، جس میں اس نے حافظ کی خمریات اور شرقیات کو شامل کر کے اسے مزید پرکشش بنا دیا ہے۔ مشرقی ادب کے ذخیرۂ الفاظ، تلمیحات وغیرہ کو اس نے استعمال ضرور کیا ہے، لیکن یہ صرف شاعرانہ اکتساب ہے اور اس سے مشرق کو کوئی ناصحانہ یا فلسفیانہ پیغام دینا مقصود نہیں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو اقبال کا 'جواب' اپنے 'سوال' سے کوئی لگّا نہیں کھاتا، کیونکہ ان کے بقول ''اس کا مدعا زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے، جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔'' ان کی چشمِ بینا اقوامِ عالم کے باطنی اضطراب کی شدت کو بھانپ لیتی ہے، جو ''بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ'' ہوتی ہے۔ اُن کے خیال میں ''زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔'' پہلی جنگِ عظیم کے بعد کاری ضربوں سے نڈھال یورپ فکری اور ادبی لحاظ سے نامساعد حالات کا شکار رہا اور اقبال کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ مسلمانوں کی طرح کہیں یورپ بھی اس 'عجمیت' کے چنگل میں نہ پھنس جائے، جو ''جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔'' اسی 'عجمیت' کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے اقبال یورپ کو کوئی حیات

آفریں پیغام دینا چاہتے تھے، لیکن اُنہوں نے یہ پیغام براہِ رست دینے کے بجائے عالمی ادب کے سر برآوردہ شاعر، جرمن ادبیات کی مشرقی تحریک کے سرخیل اور اپنے پسندیدہ شاعر گوئٹے کی ایک تصنیف کے حوالے سے پہنچایا۔ زخم خوردہ مغرب کے ساتھ ساتھ اُنہیں اسلامی مشرق کی خوابِ غفلت سے بیداری کے آثار بھی نظر آنے لگے، اس لیے اُنہیں مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولنے والی ان مشرقی اقوام کے لیے بھی راہِ عمل متعین کرنا پڑی۔ یوں دیکھا جائے تو اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کے ذریعے اقوامِ مشرق و مغرب کے باطنی اضطراب کے سامنے ایک نئی راہ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ کتاب کے ذیلی عنوان کے پیشِ نظر، اُنہیں ابتدا میں ''چمن پروردہ'' (گوئٹے) اور مکینِ ''زمینِ مردہ'' (یعنی اقبال) کے موازنے کے ساتھ ساتھ اُس کی چند معروف نظموں کے مرکزی خیال کو بھی سامنے رکھنا پڑا۔ گوئٹے نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے حافظ کی شاعری سے مقدور بھر استفادہ کیا، لیکن ''پیامِ مشرق'' پر گوئٹے کے فکری اور شعری اثرات بہت کم نظر آتے ہیں، سوائے اُن چند نظموں کے، جن کا مرکزی خیال گوئٹے کی بعض معروف نظموں سے مستعار لیا گیا ہے۔

(۲)

''پیامِ مشرق'' کی شعری تخلیقات کی طرح اس کے دیباچہ کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے اور ماہرینِ اقبالیات نے اس کے مندرجات کے بارے میں تفصیلاً اظہارِ خیال کیا ہے، بلکہ بعض اصحاب نے تو اسے جامع حواشی اور تعلیقات سمیت ترتیب دیا ہے۔ اقبال نے اس کتاب کی اشاعت سے قبل اور بعد میں اپنے متذکرہ صدر مراسلات میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ یہ درحقیقت گوئٹے کے 'دیوان' کا جواب ہے، وہ ایک مکتوب (بنام مولانا سیّد سلیمان ندوی، بابت ۱۴ر مئی ۱۹۲۲ء) میں اس دیباچے کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

> ''اس کے دیباچے میں یہ دِکھانے کی کوشش کروں گا کہ
> فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے۔'' (۱۷)

دراصل اقبال کی اس کوشش کے پس منظر میں اُن کی گوئٹے سے پرانی ذہنی وابستگی، اس کی خداداد تخلیقی صلاحیتوں سے کماحقہٗ آگاہی اور سب سے بڑھ کر مشرق کے علمی و ادبی خزینوں سے اکتساب اور اس کے زیرِ اثر جرمن ادبیات میں شروع ہونے والی تحریک جیسے عوامل کارفرما تھے۔ چونکہ اس کتاب کا بنیادی حوالہ گوئٹے ہے، اس لیے اقبال کو اس کی شرق شناسی اور اس ضمن میں اس کے متبعین کی ادبی خدمات کا اجمالی طور پر ذکر کرنا پڑا۔ بغور دیکھا جائے تو چودہ صفحات پر مشتمل یہ دیباچہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس صفحات گوئٹے اور جرمن ادب کی مشرقی تحریک کے لیے مختص ہیں اور بقیہ چار صفحات پر اُنہوں نے اپنی اس کتاب کے محرکات اور اس دور میں اپنے گردونواح میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا انتہائی بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے۔ اسی دیباچے کے حصہ اوّل یعنی ابتدائی دس صفحات پر درج کردہ معلومات کے بارے میں بعض معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

اقبال میوزیم (لاہور) میں محفوظ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اِس دیباچے کے لیے متعلقہ معلومات کو انگریزی میں قلمبند کیا تھا اور ان کے اپنے قلم سے تحریر کردہ اُن چھ صفحات کو سب سے پہلے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب بعنوان ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' (۲۲) میں اور راقم نے اپنی انگریزی کتاب ''اقبال اینڈ گوئٹے'' میں اقبال کی اس تحریر کا عکس اور اس کا ٹائپ شدہ متن شائع کر دیا ہے۔ یہ اشارات بلا تاریخ ہیں، لیکن اقبال کے مکتوب بنام سیّد سلیمان ندوی (مذکورہ بالا) کی روشنی میں ان صفحات کا زمانۂ تحریر اوائل ۱۹۲۲ء متعین کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں یہی انگریزی اشارات کچھ تبدیلیوں اور اِضافوں کے ساتھ ''پیامِ مشرق'' کا دیباچہ بنے۔

دیباچے کا آغاز جرمنی کے ایک یہودی شاعر ہائنرخ ہائنے (۱۷۹۷ء-۱۸۵۶ء) کے ایک اقتباس متعلقہ ''دیوان'' سے ہوتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

> ''یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور

اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

اقبال کا یہ اُردو ترجمہ ہائنے کی اصل جرمن عبارت سے نہیں لیا گیا بلکہ اُنہوں نے انگریزی ترجمہ کو بنیاد بنایا ہے، جو درجِ ذیل ہے:

> "...; it is a votive nosegay sent from the West to the East,... This nosegay signifies that the West is tired of thin and icy-cold spirituality, and seeks warmth in the strong and healthy bosom of the East."(۱۹)

"پیامِ مشرق" کی قلمی بیاض (مخزونہ اقبال میوزیم) کے ابتدائی صفحہ پر اقبال نے یہی انگریزی عبارت لکھی ہے۔ اقبال نے اپنی وفات (۱۹۳۸ء) سے قبل اپنے نجی کتب خانہ کا ایک بڑا حصہ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ، لاہور) کو بطور عطیہ دینے کی وصیت کر دی تھی۔ اس ذخیرۂ کتب (جو بعد میں اسلامیہ کالج، سول لائنز منتقل ہو گیا) میں ہائنے کی نثری تحریروں کا ایک انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے۔ اس میں درج بالا عبارت کا انگریزی ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> "..., it is a salam sent by the Occident to the Orient... The meaning of this salaam is that the Occident, grown weary of its frigid, meagre spiritualism, seeks again to refresh itself amid the wholesome physical pleasures of the Orient."(۲۰)

لیکن اقبال نے اوّل الذکر انگریزی ترجمہ کو ترجیح دی، البتہ جس کتاب سے یہ اقتباس لیا گیا، وہ اُن کی عطیہ کردہ یا اقبال میوزیم میں محفوظ کتب میں دستیاب نہیں۔

اقبال کے جرمن ادبیات اور فلسفہ سے ذہنی رابطے خاصے پرانے تھے، لیکن جب اُنہیں چند سال یورپ میں قیام کرنے کا موقع ملا اور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے لیے چند ماہ ہائیڈل برگ اور میونخ میں ٹھہرنا پڑا، تو پھر اُنہوں نے اپنے ان رابطوں کو مستحکم کیا، خاص طور پر

اپنے محبوب ترین شاعر گوئٹے اور اس کے زیرِ اثر جرمن ادب میں شروع ہونے والی مشرقی تحریک سے متعلق اُنہوں نے کمیاب مطبوعات کا مطالعہ بھی کیا اور ساتھ ساتھ مفید معلومات یکجا کرتے رہے۔ ''پیامِ مشرق'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے جب اُنہیں اپنے ان پرانے جمع کردہ لوازمہ کی ضرورت پڑی، تو وہ دستبردِ زمانہ ہو چکا تھا۔ صرف ایک حوالہ اُن کے ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا اور وہ جرمن ایران شناس پول ہورن (Paul Horn) کے ایک جرمن مقالے کا تھا۔ مقالہ نگار ہورن نے ہالے (Halle) یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی (۱۸۸۵ء) اور برسوں شٹراس بورگ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اس کی ''تاریخِ ادبیات فارسی'' (بزبانِ جرمن، جس کو اقبال نے ''تاریخِ ادبیاتِ ایران'' (۲۱) لکھا ہے) اب بھی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) بحوالہ اقبال۔ اس مقالے میں ہورن نے ''اس امر پر بحث کی ہے کہ گوئٹے کس حد تک شعرائے فارس کا ممنون ہے۔'' جبکہ اس کا عنوان ''ہم کیوں، ایران کے شکرگزار ہیں'' ہے۔ (۲۲) یہ مقالہ جرمنی کے ایک ماہوار رسالہ ''نورٹ انڈ سیوٹ'' (Nord und Sued شمال اور جنوب) کی چھیانویں جلد (ستمبر ۱۹۰۰ء) میں طبع ہوا تھا۔ (صفحات ۳۷۷-۳۹۵) اس کے صرف تین صفحات (۳۸۴-۳۸۶) پر گوئٹے کے 'دیوان' سمیت اس کی بعض دوسری تالیفات پر ایرانی اور عربی اثرات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مجلّہ برلین، ٹیوبنگن اور ہائیڈل برگ جیسے شہروں کے بڑے کتاب خانوں میں بآسانی دستیاب ہوسکتا ہے، لیکن اقبال کو یہ ''نہ ہندوستان کے کسی کتب خانے سے مل سکا نہ جرمنی سے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیباچہ تحریر کرتے وقت اقبال کو اپنی یادداشت یا کسی ثانوی ماخذ سے منقول پرانے نوٹ پر بھروسہ کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ایک جرمن نژاد امریکی ریمی A.F.J. (Remy، جس کا نام سہواً چارلس ریمی لکھ دیا ہے) کی مختصر مگر مفید انگریزی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ (۲۳) اور اگر بغور دیکھا جائے تو اُنہوں نے اس کے بعد جرمن ادبیات پر مشرقی اثرات کی جو تفصیلات درج کی ہیں، وہ اسی ایک کتاب سے معمولی لفظی تبدیلیوں کے ساتھ نقل کر دی ہیں۔ اقبال نے اس کتاب سے ''وسیع استفادہ'' کرتے ہوئے یہ اہتمام ضرور کیا ہے کہ اس کتاب

کے مؤلف نے جہاں جرمن ادبیات پر ہندوستان کے قدیم شعری اور علمی اثرات کا ذکر کیا ہے، اُن حصوں کو کلیتاً چھوڑ دیا ہے اور صرف فارسی اثرات کو مدنظر رکھا ہے۔ انہیں اخذ و ترک کا یہ عمل موضوع کے تقاضوں کے تحت اختیار کرنا پڑا۔ ریمی کی کتاب اور اقبال کے دیباچہ کے تقابل سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ مؤخر الذکر نے اس سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

اقبال: ''میرا قصد تھا کہ اس دیباچے میں تحریکِ مذکور [یعنی تحریکِ مشرقی] پر کسی قدر تفصیل سے بحث کروں گا، مگر افسوس ہے کہ بہت سا مواد جو اس کے لیے ضروری تھا، ہندوستان میں دستیاب نہ ہو سکا۔''

Remy: "The work does not claim to be exhaustive in the sense that it gives a list of all the poets that ever came under that influence. [e.g. Indo-Iranian East on German poetry]. Nor does it pretend to be anything like a complete catalogue of the sources whence the poets derived their material. The performance of such a task would have required for more time and space than were at my disposal."

اقبال: ''ہرڈر فارسی نہ جانتا تھا، لیکن چونکہ اخلاقی رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا، اس لیے سعدی کی تصانیف سے اسے نہایت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ''گلستاں'' کے بعض حصوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ خواجہ حافظؒ کے رنگ سے اسے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اپنے معاصرین کو سعدی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے: ''حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے۔ اس وقت سعدی کے تلمذ کی ضرورت ہے۔''

Remy: "As Herder did not know either Sanskrit or Persian... Four books of translations, more or less free of maxims from the Gulistan... Unlike his illustrious contemporary Goethe he received

from the East no impulse that stimulated him to production. His one-sided preference for the purely diadactic element rendered him indifferent to the lyric beauty of Hafid and caused him to proclaim Sa'di as the model most worthy of imitation." (pp.17,19)"

اقبال: ''شلر بھی جو مشرقی تحریک کے آغاز سے پہلے ہی مر چکا تھا، مشرقی اثرات سے آزاد ہے۔ گو اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس کا ڈرامہ ''توران دخت'' کا پلاٹ مولانا نظامی کے افسانہ دختر پادشاہ اقلیم چہارم (ہفت پیکر) سے لیا گیا ہے۔''

Remy: "... He [Schiller] died before the Oriental movement in Germany, had really begun... Though there was no direct Oriental influence on Schiller's poetry, there is one romantic poem of his which indirectly goes back to a Persian source. It is *Torandot*... Turan-dut... The oldest known model for the story is the fourth romance of Nidami's *Haft Paikar*..." (pp.28,29)

اقبال: ''۱۸۱۲ء میں فان ہیمر [صحیح اور پورا نام جوزف فان ہامر پورگشتال] نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا... گوئٹے کی عمر اُس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن وسکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخرکار ''مغربی دیوان'' کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کر لی مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و

غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوتِ تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔''

Remy: "To this Orient he [Goethe] turned at the time of Germany's deepest political degradation... The aged poet shrank from the tumult and strife about him and took refuge in the East... the direct impulse to the composition of the work was the appearance, in 1812, of the first complete version of... Hafid, by... von Hammer... The great majority of the Divan-poems are not in any sense translations or reproductions, but entirely original compositions... Hammer's translation of Hafid as the direct impulse to the composition of the Divan. It was also the principal source from which the poet drew his inspiration for the work. A single verse would often furnish a theme for a poem. Sometimes this poem would be a translation...; but more often it was a very free paraphrase." (p. 23,24)

اقبال: ''اپنی زبان میں فارسی استعارات میں (مثلاً ''گوہرِ اشعار''، ''تیرمژگاں''، ''زلف گرہ گیر'') بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔''

Remy: "Throughout the *Divan* Persian similes and metaphors are copiously employed... the lover captive in the maiden's tresses..., the arrows of the eyelashes..., the verses strung together like pearls... Goethe does not shrink from alluding to the subject of boy-love." (p.26)

[ریمی نے مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ اور حکمت نامہ کا حوالہ دیا ہے اور انہی پانچوں کا اقبال نے بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ 'دیوان' بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔]

اقبال: ''... گوئٹے کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے۔ وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انہیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے، جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔ عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے، وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلامِ حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے۔''

Remy: "...Goethe in the *Divan* preserves his poetic independence. He remains a citizen of the West, though he chooses to dwell for a time in the East. As a rule he takes from these only what he finds congenial to his own nature... He has no love for it [tasawwuf]; it was utterly incompatible with his own habit of clear thinking. Speaking to Rumi, he doubts if this poet could give a clear account of his own doctrine." (p. 27)

اقبال: ''غرضیکہ ''مغربی دیوان'' کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ [ریوکرٹ] اور بوڈن سٹاٹ [بوڈن شٹیٹ] نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔''

Remy: "With the *Divan* Goethe inaugurated the Oriental movement in German poetry which Rueckert, Platen and Bodenstedt carried to its culmination." (p.27)

اقبال: ''پلاٹن نے ادبی اغراض کے لیے فارسی زبان سیکھی۔ قافیہ ردیف بلکہ ایرانی عروض کے قواعد کی پابندی سے غزلیں لکھیں۔ رباعیاں لکھیں اور نپولین پر ایک قصیدہ بھی لکھا۔ گوئٹے کی طرح فارسی استعارات مثلاً ''عروسِ گل''، ''زلف مشکیں''، ''لالہ عذار'' کو یہ بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے اور تغزلِ محض کا دلدادہ ہے۔''

Remy: "He [Platen] at once set to work studying Persian... They [Platen's ghazals] follow as closely as possible the Persian metrical rules, and make use throughout of Persian images and metaphors" (pp. 32, 33)

[ریمی نے بھی اقبال کی استعمال کردہ تینوں تراکیب سمیت اور بھی تراکیب درج کی ہیں، ص۳۴]

"Besides the *ghazal* Platen has also attempted the *ruba'i* or quatrain..., a panegyric, for such in most cases is the Persian *qasidah* on Napoleon..." (p. 36)

اقبال: ''روکرٹ عربی، فارسی، سنسکرت تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔''

Remy: "He [Rueckert] at once took up the study of Arabic, Persian and Sanskrit." (p.38)

[ریمی نے ہفت قلزم، بہارستان، گلستان، مخزن الاسرار، امیر خسرو، منطق الطیر، عیار دانش اور مناقب العارفین کے حوالے دیئے ہیں اور یہ تمام اقبال کے دیباچے میں بھی منقول ہیں۔]

اقبال: ''اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس [ریوکرٹ] نے خوب نظم کیے ہیں، مثلاً محمود غزنوی کی موت۔ محمود کا حملہ سومنات، سلطانہ رضیہ وغیرہ

وغیرہ۔"

ریمی نے بھی انہی تینوں واقعات کا ذکر کیا ہے، (ص ۴۶-۴۷)

اقبال: "گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن شاٹ ہے، جس نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ۱۴۰ دفعہ شائع ہوا۔"

Remy: "The Hafid tendency was carried to the height of popularity by Friedrich Martin Bodenstedt whose *Lieder des Mirza Schaffy* met with a phenomenal success, running through one hundred and forty editions in Germany alone during the life-time of the anthor.." (p.64)

اقبال: "اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کو لوگ دیر تک فارسی نظم کا ترجمہ تصور کرتے رہے۔"

Remy: "Great, therefore, was the astonishment of the European, and particularly the German public, when it was discussed that the name of this famous poet was utterly unknown in the East, even in his own native land." (p.64)

اقبال: "بوڈن شاٹ نے امیر معزی اور انوری سے بھی استفادہ کیا ہے۔"

Remy: "Finally, the sixth book offers every free paraphrases of poems of Rumi, Sadi, Amir Mu'izzi and Anvari" (p.69)

اقبال: "چنانچہ ایک مقام پر [ہائنے] اپنے آپ کو عالمِ خیال میں ایک ایرانی شاعر تصور کرتے ہوئے جس کو جرمنی میں جلا وطن کر دیا گیا ہو، لکھتا ہے:

"اے فردوسی! اے جامی! اے سعدی! تمہارے بھائی زندانِ غم میں اسیرِ شیراز کے پھولوں کے لیے تڑپ رہا ہے۔"

Remy: "[Heine] goes on to imagine himself a Persian poet in exile among Germans, "O Firdaus! O Ischami! (sic of Jami) O Saadi! Wie elend ist euer Bruder! Ach wie sehne ich mich nach den Rosen von Schiras." (p.60)

اقبال: ''محمود فردوسی کے قصے کو بھی اس نے نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔''

Remy: "...one of the best known of Heine's poems, the triology "Der Dichter Firdusi", the subject of which is the famous legend of Mahmud, ingratitude to Persia's greatest singer and his tardy repentance." (p.62)

اقبال: ''اگرچہ اس کے مجموعۂ اشعار موسوم بہ ''اشعارِ تازہ'' میں عجمی اثر نمایاں ہے۔''

Remy: "His [Heine's] later poems *Neue Gedichte* (1844)... show it [Persian influence] unmistakably" (p.60)

اقبال: ''تاہم بحیثیتِ مجموعی مشرقی تحریک سے اس کا [ہائنے کا] کوئی تعلق نہیں اور اس کی رائے میں گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے سوائے جرمن شعرا کا مشرقی کلام کوئی بڑی وقعت نہیں رکھتا۔''

Remy: "..., it is clear that Heine is in no sense an orientalizing poet or a follower of the Hafizian tendency which became the vogue under the influence of Goethe..." (p.62)

اقبال: ''کم درجے کے شعرا میں خواجہ حافظ کا مقلد ڈومر، ہرمن سٹال [ہرمان شٹال]، لوشکے [لیوشکے]، سٹاگ لٹز [شٹاگ لٹس]، لنٹ ہولڈ [لاوٹ ہولٹ] اور فان شاک قابلِ ذکر ہیں۔''

Remy: "The minor Orientalizing Poets. Loeschke, Levischnigg, Wihl, Stieglitz, von Hermanstahl... Daumer, whose *Hafis* (Hamburg 1846)... Heinrich Leuthold." (p.72)

[اقبال نے دوسرے اور تیسرے شاعر کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کیا، جبکہ چوتھے اور آخری شعرا کے ناموں کا پہلا حصہ چھوڑ دیا ہے۔]

اقبال: ''موخرالذکر [فان شاک] علمی دُنیا میں اونچا پایہ رکھتا تھا۔''

Remy: "Head and schoulders above all these known poets towers the figure of Count von Schack..." (p.73)

اقبال: ''اس کی [فان شاک کی] نظمیں قصہ انصاف محمود غزنوی اور قصہ ہاروت و ماروت مشہور ہیں اور بحیثیتِ مجموعی اس کے کلام میں عمر خیام کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔''

Remy: "His [von Schack's] *Heldensangen des Firdusi*... (*Naechte des Orients*) shows the influence of 'Umar Khayyam... Oriental stories and legends are also offered, though not frequently. "Mahmud der Gasnevide"... relates the story of the great sultan's stern injustice... gives the famous legend of the angels of Harut and Marut..." (pp.74, 76, 77)

اس دیباچے کے آغاز میں اقبال لکھتے ہیں کہ: ''مجبوراً اس دیباچے کی تالیف میں کچھ تو گذشتہ مطالعہ کی یادداشت پر بھروسہ کرتا ہوں اور کچھ مسٹر چارلس ریمی کے مختصر مگر نہایت مفید اور کارآمد رسالے پر جو اُنہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔'' متذکرہ بالا امثال کو سامنے رکھتے ہوئے اس اقتباس میں لفظ ''کچھ'' محلِ نظر ہے، کیونکہ ان شواہد سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے جرمن ادب کی تحریکِ مشرقی سے متعلق اپنی تمام تر معلومات اسی ایک کتاب سے اخذ کیں اور پھر انہیں من وعن یا معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ تحریر کر دیا۔ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ گوئٹے کے مستند سوانح نگار آلبرٹ بیل شوسکی ('Albert Bielschowsky) جسے اقبال نے سہواً 'سوشکی' لکھا ہے) کی جرمن کتاب متعلقہ حیات و تصانیف گوئٹے کی ایک عبارت کا اُردو ترجمہ ہے۔ ریمی کی کتاب میں اس سوانح نگار کا ذکر موجود نہیں اور اس کی وجہ یہ

ہے کہ اس کتاب کی اشاعت (۱۹۰۱ء) تک بیل شوسکی کی جلد دوم، جس میں یہ عبارت شامل ہے، طبع نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

"بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعتِ مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرضیکہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمانِ اسرار ہے، اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے، اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔"

بیل شوسکی کی جرمن کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء تک اس کے بیالیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ یہ تمام اشاعتِ مکرر کی ذیل میں آتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں والٹر لنڈن (Walter Linden) نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ طبع کرایا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں پر مشتمل تھا اور یہ میونخ سے ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ فوراً ہی اس کا انگریزی ترجمہ کوپر (W.A. Cooper) نے تین جلدوں میں نیویارک سے شائع کرا دیا اور یہ سبھی جلدیں ان تین سالوں میں طبع ہوئیں، جب اقبال یورپ میں مقیم

رہے، یعنی ۱۹۰۵ء-۱۹۰۸ء (بذیل عنوان ''لائف آف گوئٹے'')۔ ان دِنوں اقبال جرمن زبان آسانی سے لکھ اور پڑھ سکتے تھے، اس لیے وہ بیل شوسکی کی اصل کتاب سے بھی استفادہ کر سکتے تھے، لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ اُنہوں نے متذکرہ صدر اقتباس کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے انگریزی ترجمہ ہی استعمال کیا۔ اسی ترجمہ سے متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے:

> "The bard of Shiraz seemed the very image of himself, Had he himself perchance, lived once before upon the earth in the form of the Persian? Here was the same joy of earth and love of heaven, the same simplicity and depth, truthfulness and straightforwardness, warmth and passionateness, and, finally, the same openness of heart towards everything human and the same receptive mind free from institutional limitations. Did not the same thing apply to him that the Persians said of their poet, when they called him 'the mystic tongue' and 'the interpreter of mysteries', and when they said of his poems that to outward appearance they were simple and unadorned, but that they had a deep, truth-fathoming significance and highest perfection of form? And had not Hafiz, like him, enjoyed the favour of the humble and the great? Had he not also conquered a conquerer, the mighty Timur? And had he not out of the destruction and ruin saved his own serenity, and continued to sing peacefully as before under the old accustomed conditions?" (*The Life of Goethe*, Vol. III, p.30)(۲۴)

''پیامِ مشرق'' کے اس حصے، جو جرمن ادبیات پر فارسی شعرا کے اثرات سے تعلق رکھتا ہے، کے اختتام پر اقبال رقمطراز ہیں:

> ''مشرقی تحریک کی پوری تاریخ لکھنے اور جرمن اور ایرانی شعرا کا تفصیلی مقابلہ کر کے عجمی اثرات کی صحیح وسعت معلوم کرنے کے

لیے ایک طویل مطالعہ کی ضرورت ہے، جس کے لیے نہ وقت میسر ہے نہ سامان۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔"

اب پون صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے، لیکن ابھی تک اُردو ادب اور اقبالیات کے افق کی پہنائیوں سے کسی ایسے نوجوان کے نمودار ہونے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

حواشی:

(۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی، جلد دوم، دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۷۔
(آئندہ اس کتاب کے حوالے کے لیے ''مکاتیب'' (بطورِ مخفف) استعمال کیا جائے گا۔)
اس سے قبل وحید احمد مسعود برکاتی کے نام اپنے ایک خط (بابت ۴/ستمبر ۱۹۱۹ء) میں ''پیامِ مشرق'' کی ایک نظم ''نقشِ فرنگ'' کے تین اشعار نقل کرتے ہیں (رک: مکاتیب، جلد دوم، ص ۱۲۵)

(۲) مکاتیب، جلد دوم، ص ۲۰۱

(۳) ان احباب میں مولانا گرامی اور چوہدری محمد حسین شامل ہیں۔ مثلاً اوّل الذکر کے نام درج ذیل خطوط میں ''پیامِ مشرق'' کی بعض نظموں اور شعروں کا ذکر کیا گیا ہے:
بابت ۱۲/جولائی ۱۹۲۰ء (مکاتیب، جلد دوم، ص ۱۸۸)، بابت ۲۴/مارچ ۱۹۲۱ء (ایضاً ص ۲۴۵)، بابت ۲۵/دسمبر ۱۹۲۱ء، (ایضاً، ص ۲۹۵)، بابت ۲۹/دسمبر ۱۹۲۱ء (ایضاً، ص ۲۹۶)، بابت ۳۰/دسمبر ۱۹۲۱ء (ایضاً، ص ۳۰۲)، بابت ۵/جنوری ۱۹۲۲ء (ایضاً، ص ۳۰۸)، بابت ۲۵/جنوری ۱۹۲۲ء (ایضاً، ص ۳۱۹)، بابت ۱۷/فروری ۱۹۲۲ء (ایضاً، ص ۳۳۳)، بابت ۲۶/جون ۱۹۲۲ء (ایضاً، ص ۳۷۸-۳۷۹)، بابت ۱۰/دسمبر ۱۹۲۲ء (ایضاً، ص ۴۰۳-۴۰۴)

(۴) مکاتیب، جلد دوم، ص ۴۳۹

(۵) ایضاً، ص ۳۵۶

(۶) 'سر' کے خطاب کے حوالے سے مولانا گرامی نے اقبال کو یوں مبارک باد دی: ''اقبال کو 'سر' کا خطاب ملا۔ ایک جہانِ شور در سر ہے۔ بے معنی شور ہے۔ اس شور سے بوئے حسد آ رہی ہے۔ آپ کے 'سر' نے خیرہ سروں کو سر بہ زانو کر دیا۔ گرامی، اقبال سے بھی زیادہ خوش ہے۔ مبارکباد عرض کرتا ہے...'' اور پھر یہ رباعی کہی:

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است
ہر حرف کلیدِ حکمت و فرہنگ است
اقبالؔ سر اقبال شد از جوہرِ علم
حاسد عوعو کند علاجش سنگ است

(رباعیات گرامی، ص ۳۰۰)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم کا مقالہ ''اقبال اور ٹیگور'' (انگریزی، اُردو)، ''المعارف''، بابت جنوری-مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱-۲۵ (انگریزی)، جولائی-ستمبر (۲۰۰۱ء)، ص ۴۳-۶۴ (اُردو)۔ نیز دیکھیے عبدالمجید سالک کا مضمون، جس میں اُنہوں نے اپنی نظم ''سر ہو گئے اقبال'' کی وضاحت کی ہے، در: چٹان (اقبال نمبر)، بابت ۲۵/اپریل ۱۹۶۹ء

(۷) جلد دوم، شمارہ دوم، بابت فروری ۱۹۲۳ء، ص ۴-۱۴

(۸) مکاتیب، جلد دوم، ص ۴۲۵

(۹) ایضاً، ص ۴۴۴

انہی دِنوں وہ خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں (بابت ۱۲/مارچ ۱۹۲۳ء):

''...البتہ 'پیامِ مشرق' کا ترجمہ ہونا ممکن ہے، لیکن مجھے اس قدر فرصت نہیں کہ اس کا ترجمہ کروں۔ اگر اُن کو (یعنی مغرب والوں کو) ضرورت محسوس ہوئی تو خود کر لیں گے۔'' (ایضاً، ص ۴۳۴)

یہ خط لکھنے سے چند روز قبل وہ مولانا گرامی کو بھی اطلاع دیتے ہیں (بابت ۸/مارچ ۱۹۲۳ء): ''پیامِ مشرق'' کاتب لکھ رہا ہے، دو ماہ میں یہ چھپ جائے گا۔'' (ایضاً، ص ۴۳۱)

(۱۰) اقبال کا مراسلہ بنام مہاراجہ کشن پرشاد شاد (بابت ۱۸/مئی ۱۹۲۳ء): ''حالتِ علالت میں میری چند فارسی نظموں کا مجموعہ جو 'پیامِ مشرق' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، شائع ہوا۔ میں نے پبلشرز کو پہلے ہی لکھ رکھا تھا کہ سرکار کی خدمت میں فوراً اس کا ایک نسخہ ارسال کرے۔ اُمید ہے کہ سرکارِ والا تک یہ کتاب پہنچی ہو گی۔'' (ایضاً، ص ۴۴۶)

لیکن مولانا گرامی کے نام ایک خط (بابت ۲۴/اپریل ۱۹۲۳ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایڈیشن اس ماہ یعنی اپریل کے وسط تک طبع ہو چکا تھا۔

''پیامِ مشرق خدمتِ والا میں پہنچا ہوگا۔ میں آٹھ روز سے یہاں ہوں۔ لاہور ہوتا تو کتاب آپ کی خدمت میں پہونچ جاتی۔ اس کی اشاعت میں دو ہفتہ سے زیادہ نہیں گزرا۔'' (ایضاً، ص ۴۴۵)

(۱۱) اصل انگریزی خط کے لیے رک: اقبال یورپ میں از ڈاکٹر سعید اختر درانی، طبع ثانی، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۵

(۱۲) نکلسن اس کا ترجمہ تو نہ کر سکے، لیکن اس پر اُنہوں نے ایک مضمون قلمبند کیا، جو لائپ تسک

(جرمنی) سے شائع ہونے والے علمی مجلہ ''اسلامیکا'' کے پہلے شمارے (۱۹۲۵ء) میں شائع ہوا۔

(۱۳) مکاتیب، جلد دوم، ص ۴۶۱

(۱۴) اقبال یورپ میں، مذکورہ بالا، ص ۳۷۳

(۱۵) ''پیامِ مشرق'' کے ان دونوں ایڈیشنوں (اپریل ۱۹۲۳ء اور اوائل ۱۹۲۴ء) کی درمیانی مدت میں اقبال اپنے احباب کو اس کی قبولیت عامہ اور ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کے دوسرے ایڈیشن سے آگاہ کرتے رہے۔ زمانی اعتبار سے ان کے مکتوبات سے متعلقہ اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

بنام خان محمد نیاز الدین خاں (بابت ۲۰/جولائی ۱۹۲۳ء): ''پیامِ مشرق'' کے متعلق بہت سے خطوط دور و نزدیک سے آئے ہیں۔ برلن سے ایک پروفیسر نے لکھا کہ ''حیرت انگیز'' کتاب ہے۔ پروفیسر ہارویٹز [J. Horovitz] جو علی گڑھ کے پروفیسر تھے اور اب جرمنی میں اس پر ریویو لکھ رہے ہیں جو جرمن اخبارات میں شائع ہوگا۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمۂ انگریزی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قابلِ تحسین جواب گوئٹے کے مغربی دیوان کا ہے اور جدید اور اوریجنل خیالات و افکار سے لبریز ہے۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ اس کے اثر سے آپ پر اشعار نازل ہوتے ہیں۔''

(مکاتیب، جلد دوم، ص ۴۶۳)

بنام عبدالماجد دریابادی (بابت ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۳ء): ''پیامِ مشرق میں چند اشعار ''بوئے گل'' پر ہیں، جو آپ کے ملاحظے سے گزرے ہوں گے۔ آخری شعر ہے

زندانی کہ بند زپائش کشادہ اند
آہے گذاشت است کہ بُو نام دادہ است

حال ہی میں جامعہ ملیہ علی گڑھ کے رسالے میں ''پیامِ مشرق'' پر ریویو کرتے ہوئے مولانا محمد اسلم جیراجپوری ''آہے گذاشت است'' پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترکیب مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی مطلب کسی اور طرح ادا کرنا چاہیے۔ میں آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب سے بھی استصواب کروں گا۔ چونکہ دوسری ایڈیشن جلد نکالنے کا ارادہ ہے، اس واسطے اگر آپ کا جواب جلد مل جائے تو بہتر ہو۔'' (ایضاً، ص ۴۷۹-۴۸۰)

مولانا اسلم جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ علی گڑھ کا یہ اعتراض ہے کہ ''گذاشت

است'' ذوقِ سلیم کو کھٹکتا ہے۔ مجھ کو بھی اُن کے ایراد میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور معلوم ہوتی ہے، لیکن گرامی کا فتویٰ قطعی ہوگا۔ آپ اپنی رائے صحیح سے مطلع فرمائیں۔'' (ایضاً، ص ۲۸۸)

بنام سیّد سلیمان ندوی (بابت یکم فروری، ۱۹۲۴ء): ''میں نے چند نظمیں فارسی میں لکھی تھیں جو'' پیامِ مشرق'' کی دوسری ایڈیشن میں شائع کر دی گئیں۔ انہیں نظموں میں سے ایک آپ کی خدمت میں ارسال کی گئی۔ ایک جامعہ ملیہ علی گڑھ کے لیے اور ایک علی گڑھ منتھلی کے لیے بھیجی گئی۔ اور کسی جگہ کوئی نظم میں نے نہیں بھیجی...

مولانا گرامی کی غزل میں سن چکا ہوں۔ اس کا ایک شعر مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ ع ''فقر را تر کمانئے ہم ہست'' اس شعر پر میں نے تضمین بھی کی تھی مگر'' پیامِ مشرق'' میں اس واسطے داخل نہ کی کہ اس کے اشعار کی بندش بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں۔ عرض کرتا ہوں۔'' (ایضاً، جلد دوم، ص ۵۰۷)

(۱۶) گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۲

(۱۷) مکاتیب، جلد دوم، ص ۳۵۶

(۱۸) لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۴۴۳-۴۴۷

(۱۹) The Poems of Goethe, translated in the original metres. By Edgar Alfred Bowering, 2nd Ed., rev. and enl. (including *Hermann and Dorothea*, now first added). London: George Bell, 1874 (1853), p.385.

اقبال کی ترجمہ کردہ سطور کے پورے سیاق و سباق کی تفہیم کے لیے مناسب ہوگا کہ گوئٹے کے'' دیوان'' سے متعلق ہائنے کے مکمل اقتباس کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

"It contains opinions and sentiments on the East, expressed in a series of rich cantos and stanzas full of sweetness and spirit, and all this as enchanting as a harem emitting the most delicious are rare perfumes, and blosoming with exquisitely- lovely nymphs with eyebrows painted black, eyes piercing as those of the artelope, arms white as alabastar, and of the most graceful and perfectly, formed shapes, while the heart of the reader beats and grows faint, as did that of the happy Gaspard Debaran, the clown, who, when on the highest step of his ladder, was enabled to peep into the Seraglio of

Constantinople- that recess concealed from the inspection of man. Sometimes also the reader may imagine himself indolently stretched on a carpet of Persian softness, luxuriously smoking the yellow tobacco of Turkistan through a long tube of jessamine and amber, while a black slave fans him with a fan of peacock's feathers, and a little boy presents him with a cup of genuine Mocha. Goethe has put these enchanting and voluptuous customs into poetry and his verses are so perfect, so harmonious, so tasteful, so soft that it seems really surprising that he showed ever have been able to have brought the German language to this state of suppleness. The charm of the book is inexplicable; *it is a votive nosegay sent from the West to the East*, composed of the most precious and curious plants, red rose, hortensies like the breast of a spotless maiden, purple digitales like the long finger of a man, fantastically formed ranunculi, and in the midst of all, silent and tastefully concealed, a tuft of German violets. *This nosegay signifies that the West is tired of thin and icy-cold spirituality, and seeks warmth in the strong and healthy bosom of the East.*"

(۲۰) *The Prose Writings of Heinrich Heine*, edited with an introduction, by Havelock Ellis, London: The Walter Scott, no date, pp.118-119.

(۲۱) Paul Horn: *Geschichte der persischen Literatur*. Leipzig: C.F. Amelang, 1901, in: *Die Literatur des Ostens in Einzeldarstellungen*, Bd. VI, I, Halbband.

ہورن نے جدید فارسی زبان پر بھی ایک اہم مقالہ سپردِ قلم کیا تھا، جو ایک معروف جرمن مجموعۂ مضامین میں طبع ہوا تھا۔

"Neupersische Schriftsprache", in: *Grundriss der Iranischen Philologie*, Bd. 1,2, Strassburg 1896-1904.

(۲۲) "Was verdanken wir Persien", in: *Nord und Sued*. Eine deutsche Monatschrift. Hrsg. von Paul Lindau. Breslau. XCIV. Band Septembre, 1900-Heft 282.

(۲۳) A.F.J. Rèmy: *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany*. Columbia Univ. Diss., New York 1901; Reprinted 1966.

اس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے کیا تھا، جو کراچی کے پاک جرمن فورم کی جانب سے شائع ہوا، زیرِ عنوان ''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر'' (۱۹۷۳ء)۔ ابتدا میں مترجم

نے ایک مفصل دیباچہ تحریر کیا ہے۔ (ص ۱۷-۷۰)، جس میں ریمی کی کتاب کے موضوع پر مختلف پہلوؤں سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چند سال قبل اس معلومات افزا دیباچے کو ''جرمن ادب پر اسلامی ادب کے اثرات'' کے تحت شائع کر دیا گیا ہے۔ (ماہنامہ ''ساحل'' (کراچی) جلد ۱۰، شمارہ ۸، ۹، بابت اگست-ستمبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۸-۶۹)

(۲۴) مناسب ہوگا، اگر بیل شوسکی کی اصل جرمن کتاب سے متعلقہ اقتباس بھی نقل کر دیا جائے:

"Der Saenger von Schiras erschien wie sein leibhaftiges Ebenbild. Ob er vielleicht in des Persers Gestalt schon einmal auf Erden gewandelt? Dieselbe Erdenfreundigkeit und Himmelsliebe, Einfachkeit und Tiefe, Wahrheit und Gradheit, Glut und Leidenschaftlichkeit, und endlich dieselbe Offenheit und von keinerlei Satzung eingeschraenkte Enpfaenglichkeit fuer alles Menschliche. Passte es nicht auch auf ihn, wenn die Perser ihren Dichter zugleich die mystische Zunge und den Dolmetsch der Geheimnisse nannten, wenn sie von seinen Gedichten sagten, sie waeren dem Aeusseren nach einfach und ungeschmueckte, haetten aber tiefe, die Wahrheit ergruendende Bedeutung und hoechste Vollendung? Und genoss nicht Hafis wie er die Gunst der Niederen und Grossen? Ja, eroberte er nicht auch der Eroberer, den gewaltigen Timur? Und rettelte er sich nicht aus allem Umsturz der Dinge seine Heiterkeit und sang weiter wie vordem in Frieden, in den alten gewohnten Verhaeltnissen?

(*Goethe. Sien Leben und siene Werke*, Vol.II, 1904, pp.341-342)